کبیر احمد جائسی

# اقبال اور حافظ

علامہ اقبال نے حافظ کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار — جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہن ساقی خرقۂ پرہیز او — می علاجِ ہول رستاخیز او
نیست غیر از بادہ در بازار او — از دو جام آشفتہ شد دستار او
چوں خراب از بادۂ گلگون شود — مایہ دار حشمت قارون شود
مفتیٔ اقلیم او مینا بدوش — محتسب ممنونِ پیر میفروش
طوفِ ساغر کرد مثل رنگ می — خواست فتویٰ از رباب و چنگ و نی
در رموز عیش مستی کاملی — از خمی خون در دلی یا در گلی
رفت شغل ساغر و ساقی گذاشت — بزم رندان و می باقی گذاشت
چون جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیش ہم در منزل جانان نہ دید
در محبت پیرو فرہاد بود — بر لب او شعلۂ فریاد بود
تخم نخل آہ در کہسار کاشت — طاقتِ پیکار با خسرو نداشت
مسلم و ایمان او زنار دار — رخنہ اندر دینش از مژگان یار
آنچنان مستِ شراب بندگیست — خواجہ محروم ذوقِ خواجگیست
دعویٔ او نیست غیر از قال و قیل — دست او کوتاہ و خرما بر نخیل
آن فقیہ ملتِ می خوارگان — آن امام امتِ بیچارگان
گوسفند است و نوا آموختست — عشوہ و ناز و ادا آموختست

دلربائی ہای او زہر است و بس | چشم او غارتگر شہر است و بس
ضعف را نام توانائی دہد | ساز او اقوام را اغوا کند
از گزیونان زمین زیرک است | پردۂ عودش حجاب اکبر است
نغمۂ چنگش دلیلِ انحطاط | ہاتف او جبرئیل انحطاط
بگذر از جامش کہ در مینای خویش | چوں مریدان حسن دارد حشیش
از تخیل جنتی پیدا کند | مر ترا بر نیستی شیدا کند
ناوک اندازی کہ تاب از دل برد | ناوک او مرگ را شیرین کند
مار گلزاری کہ دارد زہر ناب | صید را اول ہمی آرد بخواب
عشق با سحر نگاہش خود کشیست | کشتنش مشکل کہ مار خانگیست
حافظ جادو بیان شیرازی است | عرفی آتش زبان شیرازی است
این سوی ملک خودی مرکب جہاند | آن کنار آب رکناباد ماند
این قتیل ہمت مردانہ | آن ز رمز زندگی بیگانہ
دست این گیرد ز انجم خوشۂ | چشم آن از رشک دارد گوشۂ
روز محشر رحم اگر گوید بگیر | عرفیا! فردوس و حورا و حریر
غیرت او خندہ بر حورا زند | پشت پا بر جنت الماوی زند
بادہ زن با عرفیٔ ہنگامہ خیز | زندۂ! از صحبتِ حافظ گریز
این فسون خوان زندگی از مار بود | جام او شان جمی از مار بود
محفل او در خور ابرار نیست | ساغر او قابل احرار نیست

بی نیاز از محفل حافظ گذر
الحذر از گوسفندان الحذر

یہ اشعار اسرار خودی کے طبع اول میں شائع ہوئے تھے لیکن ان کی اشاعت کے بعد اسرار خودی پر صرف اس وجہ سے سخت تنقیدیں کی گئیں کہ اس میں حافظ کے کلام پر جو رائے دی گئی ہے وہ انتہا پسندانہ ہے۔ اقبال کا مقصد کسی ادبی شخصیت کی تنقید یا اس کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھنا نہ تھا اس وجہ سے انھوں نے اسرار خودی کے طبع دوم سے ان اشعار کو حذف کر دیا لیکن حافظ کی شاعری کے بارے میں ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی "اقبال نامہ" کے مطالعے سے اس موضوع کے متعلق ان کے منتشر خیالات کا پتہ چلتا ہے

ہم اپنی آسانی اور ترتیب مقدمہ کے لیے یہاں پر یہ خام مواد بغیر کسی تنقید و تبصرہ کے نقل کر دیتے ہیں۔
مولانا اسلم جیراج پوری کے نام ایک خط میں اقبال نے لکھا ہے:۔

"خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا۔ خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن، حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر تو خواجہ دنیا کے بہترین شعرا میں سے ہیں۔ بہر حال میں نے وہ اشعار حذف کر دیے ہیں اور ان کی جگہ اسی لٹریری اصول کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے جس کو میں صحیح سمجھتا ہوں۔ عرفی کے اشارے سے محض اس کے بعض اشعار کی طرف تلمیح مقصود تھی ... لیکن اس مقابلہ سے میں خود مطمئن نہ تھا اور یہ ایک مزید وجہ ان اشعار کو حذف کر دینے کی تھی۔" (ج ۱ ص ۵۲۔۵۳)

اس قضیۂ نامرضیہ کے سلسلے میں انھوں نے اکبر الہ آبادی کو (جو خواجہ حسن نظامی کی وجہ سے اسرار خودی کے معترضین میں تھے) اپنے موقف سے ان الفاظ میں آگاہ کیا ہے:۔

"میں نے خواجہ حافظ پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ ان کے دیوان سے مے کشی بڑھ گئی۔ میرا اعتراض حافظ پر اور نوعیت کا ہے۔ اسرار خودی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر ہے۔ اپنے وقت میں اس نصب العین سے ضرور فائدہ ہوا اس وقت یہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہے۔ خواجہ حافظ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار، نہ تھا نہ ان کی شخصیت سے۔ نہ ان اشعار میں مے سے مراد وہ مے ہے جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں بلکہ اس سے وہ حالت سکر (NACOTIC) مراد ہے جو حافظ کے کلام سے بحیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے۔" (ج ۲۔ ص ۵۳۔۵۴)

خواجہ حافظ کی شاعری سے اقبال کے اختلاف کی خاص وجہ اقبال ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

"شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں

سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے ... اس نکتۂ خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے ایران پر نظر ڈالنی چاہیے۔ (بنام سراج الدین پال، ج ۱، ص ۳۵-۳۷)

اس اختلاف کی ایک اور وجہ اقبال کے نزدیک یہ ہے:-

"تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیم کو نظم کیا ہے (جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ اس پر میں انشاء اللہ مفصل لکھوں گا) اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے (اگر اسے صوفی سمجھا جائے) یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس قوم کا نکتۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اس ترک دنیا کے پردے میں اپنی سستی کاہلی اور اس شکست کو جو تنازع للبقا میں ہو چھپایا کرتی ہیں۔" (ایضاً ص ۴۴-۴۵)

اقبال کے ان افکار کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حافظ کے کلام پر سب سے پہلا اور بنیادی اعتراض یہ ہے کہ ان کا کلام کشمکش زندگی سے عاری ہے اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری ماضی پر پشیمان، حال کی ترجمان اور مستقبل سے بے نیاز ہے۔ اس اعتراض کی سنگینی سے ہم کو انکار نہیں لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ کیا شاعری مکمل اور واضح طور سے کسی عقیدہ، کسی نظریہ یا کسی زمانے کی ترجمانی کا فریضہ ادا کر سکتی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ شاعری اگر واقعی شاعری ہے تو وہ مکمل اور واضح طور سے کسی نقطۂ نظر، کسی طرز فکر، کسی زمانے اور کسی سوسائٹی کے حدود میں محصور ہو کر نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ شعر کی تخلیق میں جو عناصر کارفرما ہوتے ہیں ان میں سے سب کے سب عناصر شعوری نہیں ہوتے بلکہ اکثر عناصر لاشعوری بھی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان شعرا کے یہاں بھی جن کو ہم صاحب پیام "شاعر" سمجھتے ہیں ہم کو اچھا خاصا تضاد نظر آتا ہے۔ بعض اوقات ہم شاعر کے اس تضاد پر محتسب کی سی گرفت کرتے ہیں اور اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ لاشعوری عناصر اسی قدر، اور اسی طرح قابل گرفت و تنقید نہیں ہوتے جس طرح کہ شعوری عناصر پر گرفت و تنقید ہونی چاہیے۔ اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ شعوری عناصر کی کارفرمائی کا غماز ہے اسی لیے ان کے طرز فکر اور انداز بیان میں ہم کو ایک طرح کا منطقی ربط اور قوت استدلال کا احساس ہوتا ہے اور ہم ان کے اشعار کی مدد سے اس کی تہ تک جا کر ایک حد تک اس بات کا پتہ لگا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک

زندگی کیا ہے؟ اس دنیا کا منتہا و مقصود کیا ہے؟ خود انسان کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے اور وہ انسان سے کن کن اخلاقی قیود و ضوابط کو برتنے کے متمنی رہتے ہیں؟ لیکن شاعری صرف کسی نظریہ کی شعوری تشریح و توضیح کا نام نہیں ہے بلکہ شاعری جذبات کا بہتر سے بہتر اور موزوں سے موزوں طریقہ سے اظہار کا نام ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے جذبات ایک خاص دائرہ تک محدود ہو کر رہ گئے ہوں بلکہ ان کے جذبات میں لمحہ بہ لمحہ تغیر و تبدل ہوتا ہو اور ان کی قوتِ حِس ان کو لحظہ بہ لحظہ ایک نئے جہانِ معنی سے روشناس کرتی ہو۔ ایسے لوگ جب اظہار جذبات کی طرف مائل ہوں گے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ ایک منطقی، مربوط اور پُر استدلال فکر کی ترجمانی کر سکیں اس لیے ہمارا خیال ہے کہ کسی شاعر پر رائے زنی کرتے وقت اس کو سہل انگاری کے ساتھ زندگی سے بیگانہ نہ قرار دیا جائے بلکہ کچھ دور تک اس کے گام بگام چلنے کی کوشش کی جائے، تاکہ اس کی فکر کے پوشیدہ اسرار و رموز ہمارے سامنے بے نقاب ہو کر آ جائیں اور ہم اس کی شاعری پر کوئی بہتر فیصلہ دے سکیں۔ حافظ جب یہ کہتا ہے ؎

در نظر بازیٔ ما بے بصران حیرانند — من چنینم کہ نمودم دگر ایشان دانند
عاقلاں نکتۂ پرکار وجودند ولی — عشق داند کہ دریں دائرہ سرگردانند
جلوہ گاہ رخ او دیدۂ من تنہا نیست — ماہ و خورشید ہمی آئینہ می گردانند
عہد ما با لب شیریں دہنان بست خدا — ما ہمہ بندہ و این قوم خداوندانند
مفلسانیم و ہوای می و مطرب داریم — آہ اگر خرقۂ پشمینہ بگرو نستانند
وصل خورشید بشب پرۂ اعمیٰ نرسد — کہ دریں آئینہ صاحب نظران حیرانند
لاف عشق و گلہ از یار زہی لاف دروغ — عشقبازان چنیں مستحق ہجرانند
مگر از چشم سیاہ تو بیاموزد کار — ورنہ مستوری و مستی ہمہ کس نتوانند
گر بنشر ہست گہ ارواح برد بوی تو باد — عقل و جاں گوہر ہستی بنثار افشانند
زاہد از رندی حافظ نکند فہم چہ شد — دیو بگریزد از آن قوم کہ قرآن خوانند
گر شوند آگہ ز اندیشۂ ما مغبچگان — بعد ازیں خرقۂ صوفی بگرو نستانند

یا جب وہ یہ کہتا ہے کہ:-

چہ مستیست ندانم کہ رو بما آورد — کہ بود ساقی و این بادہ از کجا آورد
تو نیز بادہ بدست آر و راہ صحرا گیر — کہ مرغ نغمہ سرا ساز خوشنوا آورد
دلا چو غنچہ شکایت ز کار بستہ مکن — کہ باد صبح نسیم گرہ کشا آورد
رسیدن گل و نسرین بخیر و خوبی باد — بنفشہ شاد و کش آمد سمن صفا آورد

صبا بخوش ہنری ہدہد سلیمانست — کہ مژدہ طرب از گلشن سبا آورد
علاج ضعف دل ما کرشمۂ ساقیست — برآر سر کہ طبیب آمد و دوا آورد
مرید پیر مغانم زمن مرنج ای شیخ — چرا کہ وعدہ تو کردی و او بجا آورد
بتنگ چشمی آن ترک لشکری نازم — کہ حملہ بر من درویش یک قبا آورد

تو اس کی شاعری ان ہی لمحہ بہ لمحہ بدلنے والے جذبات کی ترجمان ہوتی ہے جن کی نشان دہی اقبال کی یہ غزلیں کر رہی ہیں :-

خوشتر ز ہزار پارسائی — گامی بطریق آشنائی
در سینۂ من دمی بیاسای — از محنت و کلفت خدائی
مارا ز مقام ما خبر کن — ماییم کجا و تو کجائی
آن چشمک محرمانہ یاد آر — تا کی بتغافل آزمائی
دی ماہ تمام گفت با من — در ساز بداغ نارسائی
خوش گفت ولی حرام کردند — در مذہب عاشقان جدائی
پیش تو نہادہ ام دل خویش — شاید کہ تو این گرہ کشائی

بفغان نہ لب کشودم کہ فغان اثر ندارد — غم دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر ندارد
چہ حرم چہ دیر ہر جا سخنی ز آشنائی — نگر این کہ کس ز راز من و تو خبر ندارد
چہ ندیدنی ست اینجا کہ شرر جہان مارا — نفسی نگاہ دارد، نفسی دگر ندارد
کس ازین نگین شناسان نگذشت بر نگینم — بتو می سپارم او را کہ جہان نظر ندارد

قدح خرد فروزی کہ فرنگ داد مارا
ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر ندارد

اقبال کی ان غزلوں کو پیش کرنے کا مقصد اس بات کی نشان دہی ہے کہ اقبال بھی جن کی شاعری کا بیشتر حصّہ شعوری اظہارِ خیال کا ترجمان ہے انسانی دل کے طلسم کدہ سے باہر نہیں نکل پاتے اور ان کے یہاں بھی ایسی غزلیں مل جاتی ہیں جن کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک شاعر کا کلام ہے جو اپنے دل کے خول سے باہر نکل کر زمانہ اور اپنے گرد و پیش پر نظر نہیں ڈالتا اور زندگی کے تقاضوں سے صرفِ نظر کرنے کے جرم کا مرتکب ہے۔ لیکن اقبال کے بارے میں یہ خیال صحیح نہ ہوگا کیونکہ ان کی شاعری پر جو بھی رائے زنی کی جائے گی وہ ان کے پورے کے پورے کلام کے مطالعہ کے بعد کی جائے گی ورنہ اگر جستہ جستہ اشعار لے کر اقبال یا کسی

اور کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے تو یہ سعی سعیٔ مشکور نہ ہو سکے گی بلکہ اس سے جو بھی نتائج نکلیں گے وہ علمی اور ادبی دنیا کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے والے ہوں گے۔ جب اقبال کے پرکھنے کے لیے یہی معیار صحیح ہو سکتا ہے تو کسی دوسرے شاعر کے کلام پر نظر ڈالتے وقت اس معیار سے کیوں صرفِ نظر کیا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم حافظ کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ اقبال جیسے سنجیدہ آدمی نے حافظ کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے کیونکہ انھوں نے بھی اپنے اظہارِ خیال کے لیے انھیں تمام علائم کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا ہے جن کو حافظ کا طرۂ امتیاز کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے حافظ پر اس اعتراض کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ اس نے شراب، ساقی، جام، مینا، میخانہ، ساغر، پیمانہ، خم وغیرہ علامتوں کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنا کر "کشمکشِ حیات" کی ترجمانی سے گریز کیا ہے۔

اقبال کے عائد کردہ الزامات کی روشنی میں جب ہم خود ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک عجیب طرح کے تضاد سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ حافظ کے افکار کو مردہ قرار دے کر اس سے حذر کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور دوسری طرف خود خواجہ حافظ کی زمین میں ان کی لے سے لے ملا کر نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ اگر صرف ہم طرح زمینوں ہی کا مسئلہ ہوتا ہے تو یہ بات چنداں اہم نہ ہوتی مگر جب ان کے افکار خواجہ حافظ کے سرحدِ افکار میں داخل ہو کر دادِ سبک گامی دینے لگتے ہیں تو ہم کو سوچنا پڑتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور کیوں اقبال نے خواجہ حافظ کے افکار کی مخالفت کی ہے؟ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ہم پہلے اقبال کی ان غزلوں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو خواجہ حافظ کی زمین میں ہیں۔ ایک سرسری نظر میں میں نے اپنی بات کی وضاحت کے لیے ان غزلوں کا انتخاب کیا ہے جن کے مطلعے درج ذیل ہیں:-

| حافظ | اقبال |
| --- | --- |
| سرم خوش است و بہ بانگ بلند می گویم<br>کہ من نسیم حیات از پیالہ می جویم | باین بہانہ درین بزم محرمی جویم<br>غزل سرایم و پیغام آشنا گویم |
| جز آستان توام در جہان پناہی نیست<br>سر مرا بجز این در حوالہ گاہی نیست | اگرچہ زیب سرش افسر و کلاہی نیست<br>گدای کوی تو کمتر ز پادشاہی نیست |
| کنون کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود<br>بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود | بہار تا بگلستان کشید بزم سرود<br>نوای بلبل شوریدہ چشم غنچہ کشود |

## حافظ

اگرچه عرض هنر پیش یار بی‌ادبیست
زبان خموش ولیکن دهان پر عربیست

نه هر که چهره برافروخت دلبری داند
نه هر که آئینه سازد سکندری داند

خیز و در کاسهٔ زر آب طربناک انداز
پیشتر زانکه شود کاسهٔ سر خاک انداز

ما بدین در نه پی حشمت و جاه آمده‌ایم
از بد حادثه این جا بپناه آمده‌ایم

لعل سیراب بخون تشنه لب یار منست
وز پی دیدن او دیدن جان کار منست

شنیده‌ام سخن خوش که پیر کنعان گفت
فراق یار نه آن می‌کند که بتوان گفت

ز دست کوته خود زیر بارم
که از بالا بلندان شرمسارم

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست
که ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

## اقبال

بشاخ زندگی ما نمی ز تشنه لبی است
تلاش چشمهٔ حیوان دلیل کم طلبیست

جهان عشق نه میری نه سروری داند
همین بس است که آئین چاکری داند

دگر آشوب قیامت بکف خاک انداز
ساقیا بر جگرم شعلهٔ نمناک انداز

ما که افتنده‌تر از پرتو ماه آمده‌ایم
کس چه داند که چسان این همه راه آمده‌ایم

این جهان چیست صنم خانهٔ پندار منست
جلوه‌ی او گرو دیدهٔ بیدار منست

دگر ز ساده دلی های یار نتوان گفت
نشسته بر سر بالین من ز درمان گفت

هوای خانه و منزل ندارم
سر راهم غریب هر دیارم

هوس هنوز تماشه‌گر جهان داریست
دگر چه فتنه پس پرده‌های زنگاریست

| حافظ | اقبال |
| --- | --- |
| زاہد ظاہر پرست از حال ما آگاہ نیست | از نوا بر من قیامت رفت و کس آگاہ نیست |
| در حق ما ہرچہ گوید جای ہیچ اکراہ نیست | پیشِ محفل جز بم و زیر و مقام و راہ نیست |
| شاہد آن نیست کہ موی و میانی دارد | عاشق آن نیست کہ لب گرم فغانی دارد |
| بندۂ طلعتِ آن باش کہ آنی دارد | عاشق آنست کہ بر کفِ دو جہانی دارد |
| ای فروغ ماہ حسن از روی رخشانِ شما | چون چراغ لالہ سوزم در خیابانِ شما |
| آبروی خوبی از چاہ زنخدان شما | ای جوانان عجم جان من و جانِ شما |
| مقام امن و میٔ بیغش و رفیق شفیق | ز رسم و راہِ شریعت نکردہ ام تحقیق |
| گرت مدام میسر شود زہی توفیق | جز اینکہ منکر عشق است کافر و زندیق |
| شاہ شمشاد قدان خسرو شیرین دہنان | حلقہ بستند سرِ تربت من نوحہ گران |
| کہ بمژگان شکند قلبِ ہمہ صف شکنان | دلبران زہرہ وشان گل بدنان سیم بران |
| تا ز میخانہ و می نام و نشان خواہد بود | زندگی جوی روانست و روان خواہد بود |
| سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغان خواہد بود | این میٔ کہنہ جوانست و جوان خواہد بود |

ان تمام غزلوں کا تقابلی مطالعہ کر کے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال نے حافظ کے افکار و طرز و اسلوب سے کس حد تک استفادہ کیا ہے؟ چوں کہ ان تمام غزلوں کا تقابلی مطالعہ کافی طویل ہو جائے گا اس لیے ہم حافظ اور اقبال کی چند غزلوں کا تقابلی جائزہ لے کر اپنی بات کی وضاحت کی کوشش کریں گے۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی غزل ملاحظہ ہو:

| حافظ | اقبال |
| --- | --- |
| خیز و در کاسۂ زر آب طربناک انداز | ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز |
| پیشتر زانکہ شود کاسۂ سر خاک انداز | دگر آشوب قیامت بکفِ خاک انداز |

## حافظ

عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشانست
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز
چشم آلودہ نظر از رخ جانان دور است
بر رخ او نظر از آئینہ پاک انداز
بسر سبز تو ای سرو کہ گر خاک شوم
ناز از سر بنہ و سایہ برین خاک انداز
دل ما را کہ ز مار سر زلف تو بخست
از لب خود بشفا خانۂ تریاک انداز
ملک این مزرعہ دانی کہ ثباتی ندہد
آتشی از جگر جام در املاک انداز
غسل در اشک زدم کاہل طریقت گویند
پاک شو اول و پس دیدہ بر آن پاک انداز
یا رب آن زاہد خود بین کہ بجز عیب ندید
دودِ آہیش در آئینۂ ادراک انداز
چون گل از نکہت او جامہ قبا کن حافظ
وین قبا در رہ آن قامت چالاک انداز

## اقبال

و بیک دانہ ی گندم بزمینم انداخت
تو بیک جرعہ ی آب آنسوی افلاک انداز
عشق را بادہ ی مرد افگن و پر زور بدہ
لای این بادہ بہ پیمانہ ادراک انداز
حکمت و فلسفہ کردست گران خیز مرا
خضر من از سرم این بار گران پاک انداز
خرد از گرمی صہبا بگدازی نرسید
چارۂ کار بآن غمزۂ چالاک انداز
بزم در کشمکش بیم و امیدست ہنوز
ہمہ را بی خبر از گردش افلاک انداز
می توان ریخت در آغوش خزان لالہ و گل
خیز و بر شاخ کہن خونِ رگ تاک انداز

یہ غزل اقبال نے شعوری طور پر حافظ کی زمین میں کہی ہے اس لیے خیال ہوتا ہے کہ اس میں انھوں نے رنگ و فکر حافظ سے پوری طرح بچنے کی کوشش کی ہو گی۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟ حافظ کی پوری غزل کا مرکزی نقطہ ان دو اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے:۔

خیز و در کاسۂ زر آب طربناک انداز — پیشتر زانکہ شود کاسۂ سر خاک انداز
عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشانست — حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

اور بقیہ تمام اشعار اسی منبع سے نکلے ہوئے چھوٹے چھوٹے دریا ہیں جن میں غزل کے دیگر لوازمات پورے حسن و فنکاری کے ساتھ نمایاں ہیں۔ اس غزل میں محبوب" "زاہد خود بیں" "گل" "قامت چالاک" وغیرہ کا ذکر اسی ضمن میں کیا گیا ہے جس کی طرف مذکورہ بالا اشعار میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اقبال کی غزل کا بھی مرکزی تخیل

یہی ہے خاص طور سے ان دو اشعار کا ذکر ہماری بات کی تصدیق کے لیے کافی ہوگا۔

ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز  دگر آشوب قیامت بکف خاک انداز
حکمت و فلسفہ کردست گران خیز مرا  خضر من از سرم این بار گران پاک انداز

حافظ کے یہاں احساسِ فنا کا جو جذبہ ہے اسی کے ردعمل میں وہ دنیا میں کچھ کر رہنے کے متمنی نظر آتے ہیں اور صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ "انجام کار ہماری آخری آرام گاہ وادیٔ خاموشاں ہے (اس لیے) دنیا میں جو کچھ شور شغب مچا سکتے ہو مچا لو۔" حافظ کا یہ حرکی تصور خواہ احساس فنا ہی کی پیداوار کیوں نہ ہو اقبال کو بہت عزیز ہے اور انھوں نے الفاظ کا سانچہ بدل کر حافظ کے اس حرکی تصور کو اپنا لیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حافظ کو احساس فنا نے گراں خیز کیا اور اقبال کو حکمت و فلسفہ نے۔ لیکن اس گراں خیزی کے نتیجے میں دونوں پر ایک ہی طرح کا ردعمل ہوتا ہے ایک اپنے ردعمل کو یہ کہہ کر ظاہر کرتا ہے؛

خیز و در کاسۂ زر آب طربناک انداز  پیشتر زانکہ شود کاسۂ سر خاک انداز

اور دوسرا یہ انداز اختیار کرتا ہے:

ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز  دگر آشوب قیامت بکف خاک انداز

ایک کو یہ بات سرمست و پُرجوش رکھتی ہے:

عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشانست  حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

تو دوسرا اسی بات کے دوسرے پہلو سے سرمست ہو کر کہتا ہے:

بزم در کشمکش بیم و امیدست ہنوز  ہمہ را بی خبر از گردش افلاک انداز

غرض کہ دنیا کی جس بے ثباتی کے احساس نے حافظ سے یہ غزل کہلائی ہے اس کے زیر زمیں دھارے (UNDER CURRENTS) اقبال کی غزل میں بھی موجزن ہیں۔ اگرچہ ان دونوں غزلوں کے ظرف جدا جدا ہیں لیکن اصل جدا جدا نہیں [۱]

| حافظ | اقبال |
| --- | --- |
| زاہد ظاہر پرست از حال ما آگاہ نیست | از نوا بر من قیامت رفت و کس آگاہ نیست |
| در حق ما ہرچہ گوید جای ہیچ اکراہ نیست | پیش محفل جز بم و زیر و مقام و راہ نیست |
| در طریقت ہرچہ پیش سالک آید خیر اوست | در نہادم عشق با فکر بلند آمیختند |
| در صراطِ مستقیم ای دل کسی گمراہ نیست | ناتمام جاودانم کار من چون ماہ نیست |

۱؎ پینے سے کام ہے ہمیں میکدۂ حیات میں — ظرف جدا جدا سہی اصل جدا جدا نہیں (جگر)

## حافظ

تا چہ بازی رخ نماید بیدقی خواہیم راند
عرصۂ شطرنج رندان را مجال شاہ نیست

چیست این سقف بلند سادۂ بسیار نقش
زین معما ہیچ دانا در جہان آگاہ نیست

این چہ استغناست یارب وین چہ قادر حکمت است
کاین ہمہ زخم نہانست و مجال آہ نیست

صاحب دیوان ما گوئی نمی داند حساب
کاندرین طغرا نشان حسبۃ للہ نیست

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر چہ خواہد گو بگو
کبر و ناز و حاجب و دربان بدین درگاہ نیست

بر در میخانہ رفتن کار یک رنگان بود
خود فروشان را بکوی می فروشان راہ نیست

ہر چہ ہست از قامت ناساز بی اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالای کس کوتاہ نیست

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دایم است
ورنہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

حافظ ار بر صدر ننشیند ز عالی مشربی ست
عاشق دردی کش اندر بند مال و جاہ نیست

## اقبال

لب فرو بند از فغان در ساز با درد فراق
عشق تا آہی کشد از جذب خویش آگاہ نیست

شعلہ می باش و خاشاکی کہ پیش آید بسوز
خاکیان را در حریم زندگانی راہ نیست

جرہ شاہینی بمرغان سرا صحبت مگیر
خیز و بال و پر گشا پرواز تو کوتاہ نیست

کرم شب تابست شاعر در شبستان وجود
در پر و بالش فروغی گاہ ہست و گاہ نیست

در غزل اقبال احوال خودی را فاش گفت
زانکہ این نو کافر از آئین دہر آگاہ نیست

حافظ کی غزل جس مطلع سے شروع ہوتی ہے وہ شاعر کے اس تاثر کی غماز ہے کہ اس کی ہستی اور اس کے افکار و کوائف کو ظاہر بیں اشخاص نہیں سمجھ سکتے۔ اسی لیے وہ ان ظاہر بیں اشخاص کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا اور وہ جو کچھ چاہتے ہیں شاعر کے بارے میں کہتے رہتے ہیں۔ اپنی اس کیفیت کا سلسلہ شاعر راہ طریقت سے ملاتا ہے اور اس راہ میں جو نشیب و فراز آتے ہیں ان سب کو گوارا کرنے کی تعلیم دیتا ہوا وہ آگے بڑھ جاتا ہے اور اپنے اصل خیال کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے ؎

چیست این سقف بلند سادۂ بسیار نقش — زین معما ہیچ دانا در جہان آگاہ نیست

ہمارے خیال میں اس غزل کا مرکزی خیال یہی ہے اور پوری غزل اسی خیال کے گرد گھومتی ہے

اس خیال کے مختلف جلوے ان الفاظ میں جلوہ گر ہوتے ہیں ؎

بر در میخانہ رفتن کار یک رنگران بود　　خود فروشان را بکوی می فروشان راہ نیست
ہر چہ ہست از قامت ناساز بی اندام ماست　　ورنہ تشریف تو بر بالای کس کوتاہ نیست

اور یہی خیال شاعر کو وادیٔ غزل کی کوچہ گردی کے لیے مجبور کرتا ہے۔

اقبال نے حافظ کی غزل کو اپنے سامنے رکھ کر غزل کہی ہے شعوری طور پر تو ان کی یہی کوشش رہی ہوگی کہ وہ حافظ کے افکار سے بچ کر اپنی فکر کے نتائج پیش کریں لیکن ہمارا خیال ہے کہ اقبال کو اس سلسلہ میں کامیابی نہیں ہوئی ان کی غزل کا مطلع حافظ کے مطلع کا جواب ہے یعنی حافظ نے تو اپنی تنہائی کو سادہ اور عام فہم انداز میں پیش کر دیا ہے، اقبال نے اس کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے "محفل"، "بم وزیر و مقام وراہ" کا سہارا لیا ہے لیکن بات صرف اتنی ہی کہی ہے کہ "کس آگاہ نیست" حافظ کو بھی یہی خیال ستاتا ہے کہ اس کی حالت سے زاہد ظاہر پرست آگاہ نہیں ہے۔ حافظ نے زاہد ظاہر پرست کا لفظ استعمال کر کے اپنی فنی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے کہ وہ اشخاص جو زاہد ظاہر پرست نہیں ہیں وہ اس کے حال سے آگاہ ہیں لیکن اقبال نے یہ قید بھی اڑا دی اور "کس آگاہ نیست" کا دعویٰ کرتے ہوئے اپنی بات شروع کرتے ہیں اور اسی سلسلہ میں اپنے ناتمام ہونے کا خاص طور سے اظہار کرتے ہیں۔ یہ وہی ناتمامی کا اظہار ہے جس کے مختلف جلوے جابجا حافظ کے اشعار میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس احساس ناتمامی کے باوجود بھی اقبال ضبط فریاد کی تعلیم دیتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ عشق جب تک پابند نالہ و فریاد رہتا ہے اپنے جذب سے آگاہ نہیں ہوتا یعنی اپنے جذب سے آگاہ ہونے کے لیے ضبط فریاد ضروری ہے۔ "کس آگاہ نیست" کی منزل سے اپنی بات شروع کرنے کی وجہ سے اقبال کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ کچھ اس طرح کے خیالات نظم کریں کہ ان کی غزل کے موضوعات حافظ کی غزل کے موضوعات سے الگ ہو جائیں اس لیے شعوری طور پر انھوں نے اس غزل کی فضا کے خلاف اشعار لکھے ؎

شعلۂ می باش و خاشاکی کہ پیش آید بسوز　　خاکیان را در حریم زندگانی راہ نیست
چرہ شاہینی بمرغان چمن صحبت مگیر　　خیز و بال و پر گشا پرواز تو کوتاہ نیست

اب اگر آپ چاہیں تو خیز و بال و پر گشا الخ کا سلسلہ "کس آگاہ نیست" کے رد عمل سے ملا سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سارا ولولہ اسی احساس تنہائی کا رہین منت ہے، ان تمام باتوں کے باوجود اقبال کو اس بات کا احساس معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزل حافظ کی غزل کی صدائے بازگشت سمجھی جائے گی اسی لیے وہ اپنی غزل کا مقصد بھی مقطع میں یوں بیان کر دیتے ہیں ؎

در غزل اقبال احوال خودی را فاش گفت　　زان کہ این نو کافر از آئین دہر آگاہ نیست

مقطع کہہ کر اقبال نے قاری کی توجہ اس احساس سے ہٹانی چاہی ہے کہ ان کی غزل حافظ کی غزل سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے حالانکہ غزل کی ابتدا ہی سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ غزل کس غزل کے جواب میں لکھی جا رہی ہے اسی لیے ہمارا خیال ہے کہ اس غزل کے لیے بھی اقبال نے فکر حافظ سے مواد لیا ہے اور اس خام مواد کو اپنی غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

حافظ

شنیده ام سخن خوش که پیر کنعان گفت
فراق یار نه آن می کند که بتوان گفت

حدیث هول قیامت که گفت واعظ شهر
کنایتیست که از روزگار هجران گفت

نشان یار سفر کرده از که پرسم باز
که هر چه گفت برید صبا پریشان گفت

فغان که آن مه نامهربان مهر گسل
بترک صحبت یاران خود چه آسان گفت

من و مقام رضا بعد ازین و شکر رقیب
که دل بدرد تو خو کرد و ترک درمان گفت

غم کهن بمی سالخورده دفع کنید
که تخم خوشدلی این ست پیر دهقان گفت

گره بباد مزن گرچه بر مراد رود
که این سخن بمثل باد با سلیمان گفت

به مهلتی که سپهرت دهد ز راه مرو
ترا که گفت که این زال ترک دستان گفت

مزن ز چون و چرا دم که بنده مقبل
قبول کرد بجان هر سخن که جانان گفت

که گفت حافظ از اندیشه تو آمد باز
من این نه گفته ام آنکس که گفت بهتان گفت

اقبال

دگر ز ساده دلی های یار نتوان گفت
نشسته بر سر بالین من ز درمان گفت

زبان اگر چه دلیرست و مدعا شیرین
سخن ز عشق چگویم جز اینکه نتوان گفت

خوشا کسی که فرو رفت در ضمیر وجود
سخن مثال گهر بر کشید و آسان گفت

خراب لذت آنم که چون شناخت مرا
عتاب زیر لبی کرد و خانه ویران گفت

غمین مشو که جهان را ز خود برون ندهد
که آنچه گل نتوانست مرغ نالان گفت

پیام شوق که من بے حجاب می گویم
به لاله قطره می شبنم رسید و پنهان گفت

اگر سخن همه شوریده گفته ام چه عجب
که هر که گفت ز گیسوی او پریشان گفت

مندرجہ بالا غزل میں حافظ نے اپنی بات فراقِ یار سے شروع کی ہے اور اس غزل کا کلیدی مصرع "فراق یار نہ آن می کند کہ بتوان گفت" ہے۔ اسی سلسلہ میں وہ قیامت کی ہولناکی کو محبوب کی جدائی قرار دیتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے اور پھر کبھی بریدِ صبا کی بات کرتا ہے اور کبھی "مہ نامہربان مہر گسل کی" اس طرح رفتہ رفتہ وہ اپنے خاص موضوع تک پہنچتا ہے یعنی دفع غم کا وہی پرانا نسخہ جو اس کی شاعری کا مرکزی خیال ہے، ہمارے سامنے آتا ہے اور اس سلسلۂ سخن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے وہ سلیمان کی تلمیح استعمال کرتا ہوا اپنی غزل کا خاص مقصد ان الفاظ میں بیان کرتا ہے ؎

به مهلتی که سپهرت دهد ز یاده امرو       ترا که گفت که این زال ترک دستان گفت

مزن بچون و چرا دم که بندۂ مقبل       قبول کرد بجان هر سخن که جانان گفت

فراقِ یار کی وہ منزل جو "نہ آن می کند کہ بتوان گفت" سے شروع ہوتی تھی "قبول کرد بجاں ہر سخن کہ جاناں گفت" پر آکر ختم ہو جاتی ہے یعنی اس غزل کا وہ لہجہ جو فراقِ یار کی نغمہ سرائی سے عبارت ہے آخر تک قائم رہتا ہے اور اس کے مختلف شیڈس ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اقبال کی اس غزل میں بھی فکر حافظ کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ انھوں نے حافظ کے "بتواں گفت" کو "نتواں گفت" سے بدل کر اپنی بات کا آغاز کیا ہے یہ نتواں گفت کہ منزل "سادہ دلی ہای یار" سے شروع ہوتی ہے اور اسی "نتواں گفت" کی کارفرمائی دوسرے شعر میں بھی نظر آتی ہے جہاں وہ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ "اگرچہ عشق کا موضوع بہت دلچسپ ہے اور میری زبان کہنے میں کچھ کم بے باک نہیں ہے لیکن عشق ایک ایسا مرحلہ ہے جس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا یہاں تک کہنے کے بعد ان کو شعوری طور پر خیال آتا ہے کہ وہ حافظ کی زمین میں غزل کہہ رہے ہیں اور انھیں نے حافظ کی شاعری سے کافی اختلاف کیا ہے اس لیے ان کے اشعار کا رنگ، حافظ کے رنگ سے جدا ہونا چاہیے اس خیال کے آتے ہی وہ اپنا لہجہ اور موضوعِ سخن بدل لیتے ہیں اور "ضمیر وجود" کی ترکیب سے خود کو رنگ حافظ سے الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہوتی کیونکہ اس کے بعد کا شعر پھر خالص تغزل کا آئینہ دار ہو جاتا ہے اور حافظ کی روح اس میں جلوہ گر نظر آتی ہے یعنی، خراب لذت آنم کہ چوں شناخت مرا عتاب زیر لبی کرد و خانہ ویراں گفت۔ لیکن ابھی تک اقبال نے حافظ کی طرح زندگی کے درد کے درماں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے اس لیے "غمیں مشو" والے شعر کو کہا گیا ہے یعنی اب نتواں گفت کا مرحلہ مرغ نالاں گفت تک آ چکا ہے اور بظاہر یہی شعر اس غزل کا نقطۂ عروج معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ اقبال کا خاص پیغام ابھی تک نظم نہیں ہو سکا اس لیے اس شعر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پیام شوق کہ من بے حجاب میگویم نہ بہ لالہ [illegible] شبنم رسید و پنہاں گفت یعنی "نتواں گفت" کا مرحلہ "مرغ نالاں گفت" سے ہوتا ہوا "پنہاں گفت" تک پہنچ

اور اس "نہاں گفت" کا جواز اس شعر میں دیکھا جا سکتا ہے ؎

اگر سخن ہمہ شوریدہ گفتہ ام چہ عجب
کہ ہر کہ گفت ز گیسوی او پریشان گفت

حافظ نے جس بات کو غزل کے شروع ہی میں صاف اور سیدھے انداز میں کہہ دیا تھا اقبال اسی کا عکس اپنے آخری شعر میں پیش کرتے ہیں لیکن در بدر کی بادیہ پیمائی کے بعد، اسی لیے ہمارا خیال ہے کہ اقبال کی مندرجہ بالا غزل بھی اپنی فکری فضا اور لہجہ کی وجہ سے ان غزلوں میں شمار کی جا سکتی ہے جن پر حافظ کے رنگ کی چھاپ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اقبال ایک عظیم فنکار ہونے کی وجہ سے اپنی بات اس انداز میں کہہ گئے ہیں کہ بظاہر ان کی غزل صرف ان کے رنگ کی حامل نظر آتی ہے لیکن جب ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ کے استعمال پر غور کر کے ان دونوں غزلوں کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ الفاظ کا پیراہن تو ضرور بدلا ہے لیکن فکر کا دھارا ایک ہی سطح پر رواں دواں ہے۔

| حافظ | اقبال |
| --- | --- |
| ز دست کوتہِ خود زیر بارم | ہوای خانہ و منزل ندارم |
| کہ از بالا بلندان شرمسارم | سر راہم غریب ہر دیارم |
| گر زنجیر موی گیردم دست | سحر می گفت خاکستر صبا را |
| وگرنہ سر بشید ائی برآرم | فسردہ از باد این صحرا شرارم |
| ز چشم من بپرس اوضاع گردون | گذر نرمک پریشانم مگردان |
| کہ شب تا روز اختر می شمارم | ز سوز کاروانی یادگارم |
| بدین شکرانہ می بوسم لب جام | ز چشم اشک چو شبنم فرو ریخت |
| کہ کرد آگہ ز راز روزگارم | کہ من ہم خاکم و در رہگذارم |
| اگر گفتم دعای میفروشان | بگوش من رسید از دل سرودی |
| چہ باشد حق نعمت می گذارم | کہ جوی روزگار از چشمہ سارم |
| من از بازوی خود دارم بسی شکر | ازل تاب و تب پیشینۂ من |
| کہ زور مردم آزاری ندارم | ابد از ذوق و شوق انتظارم |
| سری دارم چو حافظ مست لیکن | میندیش از کف خاکی میندیش |
| بلطف آن سری امیدوارم | بجانِ تو کہ من پایان ندارم |

حافظ کی غزل جس لطیف احساسِ محرومی سے شروع ہوتی ہے اس کا تعلق دو پہلوؤں سے ہے۔ اول تو یہ کہ شاعر کو اپنی کوتاہ دستی کا شدت سے احساس ہے، یہ احساس اگرچہ دنیا کے دیگر اشخاص

کو بھی ہو سکتا ہے مگر شاعر کے احساس میں شدت اس کے دوسرے پہلو کی وجہ سے آئی ہے یعنی اس شدت احساس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی کوتاہ دستی کی وجہ سے "بالا بلنداں" سے "شرمسار" ہونا پڑا، انسان کا کوئی بھی احساس محرومی ہو اگر اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہے تو اس کا احساس شدت کے ساتھ نہیں ہوتا لیکن جب اسی محرومی کی وجہ سے اس کو دوسروں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا ہے تو محرومی کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے، حافظ کا مطلع اسی انسانی کیفیت کا غماز ہے۔ اس غزل کا دوسرا شعر بھی مطلع ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں غزل کے مخصوص علائم زنجیر، مو، سرو غیرہ کو پردہ بنا کر اس کیفیت کو چھپا دیا گیا ہے، یہی احساس محرومی ہے جو شاعر کو شب بیداری پر مجبور کرتا ہے اسی وجہ سے وہ بلند آہنگی کے ساتھ دعوی کرتا ہے کہ زمانے کے تغیر و تبدل کا حال اس سے پوچھا جائے کیونکہ وہ ہر لمحہ بیدار رہتا ہے، گویا احساس محرومی نے بیداری کی عادت ڈالی اور بیداری نے شاعر کو "اوضاع گردوں" کا محرم راز بنا دیا، اسی سلسلۂ سخن میں حافظ کا محبوب مضمون آ جاتا ہے ؎

بدین شکرانہ می بوسم لب جام　　که کرد آگه ز راز روزگارم
اگر گفتم دعای میفروشان　　چه باشد حق نعمت می گذارم

یعنی اگر ایک طرف شاعر کی شب بیداری نے اس کو رازِ دہر سے آگاہ کیا تو دوسری طرف لب جام نے بھی اس کو اس عرفانِ حقیقت سے نوازا اور شاعر رازِ دہر کا محرم بن گیا اس طرح وہ احساس محرومی جس سے شاعر دوسروں کے سامنے پشیمان تھا اس کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ بن کر سامنے آئی اس کے باوجود احساس محرومی کی وجہ سے شاعر کے وہاں جو ناتوانی راہ پا گئی تھی اس کی توجیہ ابھی باقی تھی اسی لیے شاعر نے یہ فنکارانہ انداز اختیار کیا کہ

من از بازوی خود دارم بسی شکر　　که زوری مردم آزاری ندارم

اگرچہ شاعر کو زور بازو نہ رکھنے کا غم ہے لیکن اس نے اپنے غم کو اس پردے میں چھپا دیا ہے کہ "چلو اچھا ہوا مجھ میں زور مردم آزاری نہیں ہے" غرضکہ یہ غزل شروع سے لے کر آخر تک شاعر کے احساس محرومی کی عکاسی کرتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال نے اس احساس محرومی سے کس حد تک اکتساب کر کے اپنی بات کہی ہے؟ ہمارے خیال میں اقبال نے اپنے احساس محرومی کو طرز حافظ سے الگ کرنے کے لیے ذاتی کے بجائے کائناتی رنگ دے دیا ہے اور اپنے مطلع میں غریب ہر دیارم کہہ کر حافظ کے احساس محرومی سے خود کو الگ کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ یہ وہی احساس محرومی ہے جو حافظ کو بالا بلنداں کے سامنے شرمسار رکھتا ہے لیکن "ہوا می خانہ و منزل ندارم" کہہ کر انھوں نے اپنی مزاجی کیفیت کو جس انداز میں

پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ بظاہر حافظ کی مزاجی کیفیت سے الگ نظر آتی ہے، بات چونکہ غریب ہر دیارم سے شروع ہے اس لیے دوسرے شعر میں بھی اسی قسم کے مضمون کو ایک منفرد انداز سے باندھنے کی کوشش کی گئی ہے خاص طور سے "ہوای خانہ و منزل" اور "باد صحرا" میں جو لفظی مماثلت ہے وہ شاعر کی بے چینی اور در پردہ احساس محرومی کی غماز ہے، ایک طرف تو بے چینی اور احساس محرومی کا یہ عالم کہ شاعر خود کو غریب ہر دیارم" کہتا ہے اور دوسری طرف خود ترحمی کا یہ عالم ہے کہ

گذر نرمک پریشانم گردان    زسوز کارواں یادگارم

کا بھی نعرہ لگاتا ہے۔ اسی سلسلۂ سخن میں وہ خود کو خاک و رہگذار کہتا ہوا اپنی محرومی کا اظہار کرتا جاتا ہے یہ احساس محرومی اقبال کی مخصوص فکر سے میل نہیں کھاتا اور ان کی زندگی کا جو حرکی تصور ہے وہ بھی اس قسم کے خیالات سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے اس غزل میں یہ دو شعر خاص طور سے بڑھائے جاتے ہیں ؎

بگوش من رسید از دل سُرودی    کہ جوی روزگار از چشمہ سارم
ازل تاب و تب دیرینۂ من    ابد از ذوق و شوق انتظارم

"جوی روزگار" "ازل اور ابد" کا یہ تذکرہ اقبال کے محسوسات کو حافظ کے محسوسات سے الگ کرتا ہے لیکن ان ساری لفظی تبدیلیوں کے پس پردہ ہم کو وہی احساس محرومی کارفرما نظر آتا ہے جو اس غزل کے مطلع سے جھلکنا شروع ہو گیا تھا۔ آخری شعر تک آتے آتے شاعر پھر پلٹا کھاتا ہے اور اس کا احساس محرومی اس رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے ؎

میندیش از کفِ خاکی میندیش    بجان تو کہ من پایاں ندارم

اگرچہ اس شعر میں من پایاں ندارم" کا دعویٰ کیا گیا ہے لیکن "میندیش" کی تکرار نے ان کے اس احساس محرومی کو بے نقاب کر دیا ہے جس کو چھپانے کے لیے انھوں نے اس سے پہلے کے دو شعر لکھے ہیں۔ غرضکہ باد صحرا، سوز کارواں، جوی روزگار، ازل اور ابد کے الفاظ بھی شاعر کے احساس محرومی کو نہ چھپا سکے اور اس کی مزاجی کیفیت نمایاں ہو کر سامنے آگئی، حافظ نے اپنی محرومی کے لیے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اس کو غمِ ذاتی کا نام دیا جا سکتا ہے اور اقبال کے پیرایۂ بیان کو کائناتی غم کہا جا سکتا ہے لیکن ان کے اس کائناتی غم کی جڑیں ذاتی غم کے سینہ میں پیوست ہیں اور وہ یہیں سے قوت نمو حاصل کرتا ہے۔ اقبال کی غزل کی پوری فضا، لہجہ کا سوز و گداز اور محرومی کا شدید احساس اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس غزل میں بھی وہ حافظ کے رنگ کلام سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں جہاں انھوں نے نئے مضامین اور چونکا

دینے والی تراکیب کا استعمال کیا ہے وہیں ان کے پس پردہ وہ محرومی بھی جھلک پڑتی ہے جو حافظ کو "بالا بلنداں" کے سامنے شرمسار رکھتی ہے۔ اسی لیے ہم اقبال کی اس غزل کو بھی رنگ حافظ کی غزلوں میں شمار کرتے ہیں اور ہمارا یہ خیال ہے کہ حافظ کے رنگ کی گرفت ان پر اتنی سخت ہے کہ وہ حافظ کے کلام پر تنقید کرنے کے باوجود اس سے دامن کش نہیں ہو پاتے۔

## حافظ

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود
بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود
بنوش جام صبوحی بنالۂ دف و چنگ
ببوس غبغب ساقی بنغمۂ نی و عود
بدور گل منشین بی شراب و شاہد و چنگ
کہ ہم چو روزگار بقا ہفتہ بود معدود
شد از خروج ریاحین چو آسمان روشن
زمین باختر میمون و طالع مسعود
ز دست شاہد نازک عذار عیسیٰ دم
شراب نوش و رہا کن حدیث عاد و ثمود
جہان چو خلد برین شد بدور سوسن و گل
ولی چہ سود کہ در وی نہ ممکن ست خلود
چو گل سوار شود بر ہوا سلیمان وار
سحر کہ مرغ در آید بنغمۂ داؤد
بباغ تازہ کن آئین دین زردشتی
کنونکہ لالہ بر افروخت آتش نمرود
بخواہ جام صبوحی بیاد آصف عہد
وزیر ملک سلیمان عماد دین محمود
بیار بادہ کہ حافظ مدامش استظہار
بفضل رحمت جبار بود و خواہد بود

## اقبال

بہار تا بگلستان کشید بزم سرود
نوای بلبل شوریدہ چشم غنچہ کشود
گماں مبر کہ سرشتند در ازل گل ما
کہ ما ہنوز خیالیم در ضمیر وجود
بعلم غرہ مشو کار می کشتی دگر ست
فقیہ شہر گریبان و آستین آلود
بہار برگ پراگندہ را بہم بربست
نگاہ ماست کہ بر لالہ رنگ و آب افزود
نظر بخویش فروبستہ را نشان این است
دگر سخن نہ سراید ز غائب و موجود
شبی بمیکدہ خوش گفت پیر زندہ دلی
بہ ہر زمانہ خلیل است و آتش و نمرود
چہ نقشہا کہ نہ بستم بکارگاہ حیات
چہ رفتنی کہ نرفت و چہ بودنی کہ نبود
بہ بریان سخن نرم گو کہ عشق غیور
بنای بتکدہ افگند در دل محمود
بخاک ہند نوای حیات بی اثر است
کہ مردہ زندہ نگردد ز نغمۂ داؤد

حافظ کی غزل کا مطلع "چمن" "گل" "بنفشہ" کے علائم سے شروع ہوتا ہے اور وہ کوائف عالم پر نظر ڈالنے کے لیے ان علائم کا سہارا لیتا ہے اور اپنی بات کو علائم کے دبیز پردوں میں چھپا دیتا ہے، انھیں علائم کے استعمال کی وجہ سے تسلسل قائم رکھنے کے لیے وہ دوسرے شعر میں بھی چند علائم ساقی، نی، اور عود کا سہارا لیتا ہوا اپنا پیغام نشاط نظم کرتا ہے۔ لیکن تیسرے شعر میں اس کا اصل مقصد علائم کے پردوں سے بھی نہیں چھپتا اور سامنے آجاتا ہے اور وہ اپنی بات صراحت کے ساتھ اس انداز کے ساتھ کہتا ہے "کہ ہم جو روزگار بقا بفتہ بود معدود" اس صراحت کے بعد وہ پھر اپنے پرانے انداز کو اختیار کرکے "ریا حین" "اختر میموں" اور "طالع مسعود" کے پردے میں اپنی بات کو چھپا دیتا ہے یعنی قاری کو علائم کے پردے میں الجھا کر دوبارہ اپنی بات نئے سرے سے کہنے کی تیاری کرتا ہے اور اس بار وہ پہلے سے بھی زیادہ صاف صاف انداز میں کہتا ہے کہ محبوب کے ہاتھوں سے شراب پیو اور قوم عاد و ثمود کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤ" یعنی آج اور صرف آج کی فکر کرو اور ماضی و مستقبل کو یکسر فراموش کردو لیکن اسی کے ساتھ ساتھ دنیا کی حصول یابی اس کو ممکن نہیں نظر آتی اور اس حادثہ کو سمجھانے کے لیے وہ پھر شاعرانہ انداز بیان اختیار کرتا ہے جس سے حادثہ کی سنگینی ایک گونہ کم ہو جاتی ہے اور قاری کو دنیا کو حاصل نہ کر سکنے کا غم نہیں ہوتا۔ اس حادثہ کا اثر کم کرنے کے لیے وہ پھر سلیمان اور داؤد کی تلمیحات استعمال کرکے قاری کے ذہن کو ماضی کے دھندلکوں کی طرف مبذول کر دیتا ہے تاکہ دنیا کو نہ پاسکنے کا غم اس کو از کار رفتہ نہ کر دے۔ اس فن کارانہ چابکدستی کے بعد وہ پھر اپنا پرانا نسخہ استعمال کرتے ہوئے قاری کو غرق جام شراب ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ یہ وہی موضوع ہے جو بار بار اپنا پیراہن بدل کر فکر حافظ میں جلوہ گر ہوا کرتا ہے اس کے بعد کا شعر کسی وقتی ضرورت کے تحت لکھا گیا ہے اس وجہ سے ہم اس کو غزل سے خارج سمجھتے ہیں۔ مقطع میں پھر وہی جام شراب کی جلوہ گری ہے۔ یہ پوری کی پوری غزل جو آمد بہار سے شروع ہوئی ہے علائم و رموز کے پردے ہی پردے میں کوائف عالم پر روشنی ڈالتی ہوئی فکر حافظ کے ہر ہر پہلو کی عکاسی کرتی جاتی ہے۔

اقبال کی غزل حافظ ہی کی زمین اور بحر میں ہے اور انھوں نے بھی اپنی غزل اسی انداز سے شروع کی ہے جس طرح حافظ نے کی تھی۔ وہی "بہار" "گلستاں" "بلبل شوریدہ" اور "چشم غنچہ" کے علائم ہیں جو "برہنہ حرف نہ گفتن" کی مثال ہوتے ہوئے بھی حقیقت کے غماز ہوتے ہیں۔ اقبال نے اپنی غزل اس انداز سے شروع تو کر دی لیکن ذہن میں یہ خیال بسا ہوا ہے کہ وہ حافظ کی زمین میں غزل کہہ رہے ہیں اور ان کی غزل کا انداز حافظ کی غزل کے انداز سے جدا ہونا چاہیے اس لیے دوسرے شعر میں وہ اپنی بات کو فلسفیانہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور "تنازل" اور "ضمیر وجود" کا سہارا لے کر ایک نئی بات کہتے ہیں لیکن حافظ کے رنگ کا

جادودان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور وہ بھی "کارِ مے کشی" کی عکاسی پر مجبور ہو جاتے ہیں اگرچہ "بعلم غرہ مشو" کہہ کر انھوں نے اپنے منفرد انداز بیان کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اگر "علم" کا لفظ نکال دیا جائے تو فکر حافظ صاف جھلکنے لگتی ہے۔ اتنے الجھاوے کے بعد اقبال کو پھر علائم کا سہارا لینا پڑا اور "بہار" "برگ پراگندہ" "لالہ" "آب و رنگ" کے پردے میں اپنی بات کہنے پر مجبور ہوئے یہیں پر شاعر کو احساس ہوتا ہے کہ یہ زبان تو حافظ کی ہے اس لیے وہ اس کے بعد کے شعر میں پھر غائب و موجود کے فلسفہ کا سہارا لے کر خود کو رنگ حافظ سے الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ کوشش دیر تک قائم نہیں رہتی اور پھر "میکدہ" "پیر زندہ دل" کا تذکرہ آ جاتا ہے اگرچہ خلیل و آتش و نمرود کی تلمیحات کو استعمال کر کے وہ میکدہ اور پیر زندہ دل کے مفہوم کو نئے معانی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کے بعد جو تین شعر ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں اقبال نے فلسفہ کا سہارا لے کر اپنی بات کو کہنے کی کوشش کی ہے اگرچہ "بتکدہ" اور "نغمۂ داؤد" کی یہاں بھی کارفرمائی ہے لیکن "دیریان سخن" اور "خاک ہند" وغیرہ کے تذکرہ نے ان اشعار پر فکر اقبال کی چھاپ لگا دی ہے۔ اس غزل کو پڑھ کر مجموعی تاثر یہی ہوتا ہے کہ اقبال نے بھی اس غزل میں کوائف عالم پر نظر ڈالی ہے اور اپنی بات ٹھیک اسی انداز سے شروع کی ہے جس انداز سے حافظ نے کی تھی۔ حافظ اپنے محبوب موضوع "جام شراب" سے طرح طرح کے مضامین پیدا کرتے ہوئے کوائف عالم پر نظر ڈالتے رہے اور اقبال کبھی میکدہ، بہار، لالہ، برگ پراگندہ کے علائم سے اور کبھی کارگاہِ حیات، "ضمیر وجود"، "دیریان سخن" کے پردوں سے کام لیتے رہے۔ اسی وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں غزلوں کا مرکزی نقطہ ایک ہی ہے اور یہ دونوں کی دونوں غزلیں ایک جیسے جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو صرف اتنا ہے کہ ایک بیسویں صدی کی آواز ہے اور دوسری صدیوں پہلے کی۔ ورنہ وہی مسائل جو انسانی ذہن کو اکثر پریشان کرتے ہیں۔ ان دونوں غزلوں میں موجود ہیں۔ اگرچہ دونوں فنکاروں نے ان مسائل پر لالہ و گل کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ پردے ان مسائل کو نہ چھپا سکے اور قاری کا ذہن ان مسائل تک پہنچ ہی گیا، اسی لیے ہمارے خیال میں اقبال کی یہ غزل بھی رنگ حافظ سے الگ قرار نہیں دی جا سکتی۔

**حافظ**

مقام امن و مئ بےغش و رفیق شفیق
گرت مدام میسر شود زہی توفیق
جہان و کار جہان جملہ ہیچ بر ہیچ است
ہزار بار من این نکتہ کردہ ام تحقیق

**اقبال**

ز رسم و راہ شریعت نکردہ ام تحقیق
جز اینکہ منکر عشق است کافر و زندیق
مقام آدم خاکی نہاد دریابند
مسافران حرم را خدا دہد توفیق

| اقبال | حافظ |
|---|---|
| من از طریق نہ پرسم رفیق می جویم | دریغ و درد کہ تا این زمان نہ دانستم |
| کہ گفتہ اند نخستین رفیق و باز طریق | کہ کیمیای سعادت رفیق بود رفیق |
| کند تلافی ذوق آن چنان حکیم فرنگ | بہ مامنی رو و فرصت شمر غنیمتِ وقت |
| فروغ بادہ فزون تر کند بجام عقیق | کہ در کمین گہ عمر اند قاطعانِ طریق |
| ہزار بار نکوتر متاعِ بے بصری | بیا کہ توبہ ز لعل نگار و خندۂ جام |
| ز دانشی کہ دل او را نمی کند تصدیق | حکایتی ست کہ عقلش نمی کند تصدیق |
| بہ پیچ و تاب خرد گرچہ لذت دگر ست | اگرچہ موی میانت بچون منی نرسد |
| یقین سادہ دلان بہ ز نکتہ ہای دقیق | خوش ست خاطرم از فکر این خیال دقیق |
| کلام و فلسفہ از لوح دل فروشستم | حلاوتی کہ ترا در چہ زنخدانست |
| ضمیر خویش گشادم بہ نشتر تحقیق | بکنہ آن نرسد صد ہزار فکر عمیق |
| ز آستانۂ سلطان کنارہ می گیرم | اگر برنگ عقیقی شد اشک من چہ عجب |
| نہ کافرم کہ پرستم خدای بی توفیق | کہ مہر خاتم لعل تو ہست ہم چو عقیق |
| | بخندہ گفت کہ حافظ غلام طبع توام |
| | ببین کہ تا بچہ حدم ہمی کند تحمیق |

حافظ کی مندرجۂ بالا غزل ان کے مخصوص طرز فکر کی مکمل ترجمان ہے، مطلع میں "زہی توفیق" کہہ کر انھوں نے انسانی محرومی کو بڑی خوبصورتی سے واضح کر دیا ہے اگرچہ ان کے نزدیک "مقام امن" "مئی بے غش" اور "رفیق شفیق" سے بڑھ کر دنیا کی کوئی نعمت نہیں ہو سکتی لیکن یہ نعمتیں روز روز اور ہمیشہ حاصل نہیں ہوتیں اسی لیے اس نے دوسرے شعر میں یہ بات صاف کر دی ہے کہ یہ دنیا اور اس کے علائق سب ہیچ ہیں کیونکہ شاعر ہزاروں بار اس کا تجربہ کر کے دیکھ چکا ہے یہ اسی احساس محرومی کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کی طرف مطلع میں اشارہ کیا جا چکا ہے لیکن شاعر مسلسل احساس محرومی کا اظہار کر کے قاری کو مکدّر کرنا نہیں چاہتا اس لیے وہ بات کو صرف اپنی ذات تک محدود کر کے کہتا ہے کہ "افسوس میں نے اس وقت تک نہ جانا کہ کیمیای سعادت کسی رفیق کی صحبت ہے" شاعر اپنی ذات کو درمیان میں لا کر قاری کی توجہ کو تھوڑی دیر کے لیے اس کے مسائل سے ہٹا دیتا ہے اور پھر فن کاری کے ساتھ ایک نئے انداز سے اسی مسئلہ کو سامنے لاتا ہے اور کہتا ہے کہ "جو کچھ بھی وقت تم کو مل جائے اس کو کسی امن کی جگہ پر گزار دو کیونکہ

عمر کی راہ میں رہزن بیٹھے ہوئے ہیں۔ بظاہر تو یہ شعر شاعر کے فرار کی کہانی سناتا ہے لیکن بباطن اس شعر میں یہ رمز پنہاں ہے کہ تم کو جو کچھ بھی زمانہ وقتِ فرصت دے اس کو امن و آسائش کے ساتھ گزار دو، اسی سلسلۂ سخن میں وہ دعوت شرابِ ناب دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ توبہ کا مسئلہ ایسا ہے کہ عقل اس کی تصدیق نہیں کرتی، یعنی یہاں پر بھی وہ عمر کے ان لمحات کو جو اس کو ملے ہیں امن و آسائش سے گزارنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس تعلیم کے بعد وہ قاری کو خیالی دنیا میں لے جاتا ہے کہ اس کی فکر کچھ دیر دم لے سکے اور ایک نئی قوت کے ساتھ مسائل کو سمجھنے کے لیے آمادہ ہو سکے اسی لیے وہ اس کے بعد کے شعر میں چہ زنخداں کی حلاوت کا تذکرہ کرتا ہے اگرچہ اس کے راز فکرِ عمیق کی رسائی میں نہیں ہیں لیکن یہ تذکرہ قاری کو خیالی دنیا میں لے جاتا ہے اور شاعر کا یہ عمل مقطع تک قائم رہتا ہے گویا کہ اس نے شعوری طور پر چند مسائل اٹھانے کے بعد قاری کی فکر کو صرف اس لیے خیالی دنیا میں اسیر کر دیا ہے کہ مسائل کی سنگینی اس کی ہمت کو پست نہ کرنے پائیں۔ اس طرح وہ اپنی غزل کو اختتام تک پہنچاتا ہے اور اپنی بات کو ادھوری چھوڑ دیتا ہے تاکہ قاری کا ذہن خود اس کو مکمل کر لے۔

اقبال نے حافظ کی زمین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یوں نغمہ سرائی کی ہے کہ مطلع میں انھوں نے عشق کی اہمیت کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرے نزدیک تو کافر و زندیق وہ شخص ہے جو عشق کا منکر ہو یعنی انھوں نے رنگ حافظ سے اپنے کو الگ کرنے کے لیے "رسم و راہِ شریعت" اور "کافر و زندیق" کا سہارا لیا ہے اور اسی رو میں "مقامِ آدمِ خاکی" کی تلاش کی نغمہ سرائی کرتے ہوئے مسافرانِ حرم کے حق میں دعا کی ہے۔ لیکن تیسرے میں شعر سے رنگ حافظ کی گرفت ان پر مضبوط ہونے لگتی ہے اور وہی مضمون ہمارے سامنے آ جاتا ہے جس کو کہ حافظ نے رفیقِ شفیق کے پردے میں باندھا ہے۔ یہیں پر ان کو احساس ہوتا ہے کہ ان کی لے پھر حافظ کی لے سے مل گئی ہے اسی لیے وہ شعوری طور پر "حکیمِ فرنگ" کا تذکرہ کرتے ہیں اگرچہ اس تذکرہ میں بھی "فروغِ بادہ" اور "جامِ عتیق" کا سہارا لیے بغیر وہ اپنی بات مکمل طور پر نہیں کہہ پاتے اور ان الفاظ کے استعمال کا کفارہ وہ یوں ادا کرتے ہیں کہ بے بصری کا فلسفہ پیش کر کے "مقامِ دل" کی نشاندہی کرتے ہیں اور اسی سلسلۂ سخن میں وہ "سادہ دلوں کے یقین" کی اہمیت کو جتاتے ہوئے پھر فلسفہ کا سہارا لیتے ہیں اگرچہ اس شعر میں کلام و فلسفہ کو اپنے دل سے محو کرنے کی بات کہی گئی ہے لیکن یہ بات خود اپنی جگہ پر فلسفیانہ انداز میں پیش کی گئی ہے اور اسی وجہ سے غزل کی مخصوص فضا سے الگ سی آتی ہے یہی رنگ آخر تک قائم رہتا ہے اور وہ بھی حافظ کی طرح اپنی بات ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔

ان دونوں غزلوں کے تقابلی مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ نے اپنی بات کو صاف اور راست انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے اور جہاں ان کو یہ محسوس ہوا کہ قاری ان باتوں سے کبیدہ ہو جائے گا وہیں وہ اس کو ایک خیالی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف اقبال نے اپنی بات بالواسطہ انداز میں

کہی ہے کہیں انھوں نے پرانے رموز و علائم کا سہارا لیا ہے تو کہیں جدید فلسفہ کی اصطلاحات کے استعمال سے اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی اندرونی کشمکش کہ وہ حافظ کی زمین میں غزل کہہ رہے ہیں ان اشعار کو مسلسل ومربوط نہیں ہونے دیتی۔ ورنہ اقبال کی غزل کا تقاضا تو یہ تھا کہ "بے بصری" "پیچ و تاب خرد" "یقین سادہ دلان" "کلام و فلسفہ" وغیرہ کا استعمال نہ کیا جائے بلکہ چونکہ رسم و راہ شریعت سے بات شروع کی گئی ہے اسی لیے اسی کی مناسبت سے تمام علائم پیش کیے جائیں۔ حافظ کی غزل کا بنیادی مرکزی خیال یہ ہے کہ آج جو کچھ فرصت میسر ہے اسی کو غنیمت سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہو لیا جائے۔ اقبال بھی درپردہ اس بات کے قائل معلوم ہوتے ہیں لیکن انھوں نے زندگی کا جو حرکی تصور عام طور سے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے وہ اس قسم کے مضمون کا متحمل نہیں ہوسکتا اسی لیے صرف

من از طریق نپرسم رفیق می جویم  کہ گفتہ اند نخستین رفیق و باز رفیق

کہہ کر اپنی بات مکمل کر دینے کی کوشش کی ہے اور جو خلا رہ گیا ہے اسے قاری کو پُر کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اسی بنا پر ہم نے اس غزل کو رنگ حافظ کی غزلوں میں شمار کیا ہے اگرچہ اس غزل میں خاص طور سے اقبال نے خود کو رنگ حافظ سے بہت بچانے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی جھلک سے پھر بھی نہ بچ سکے۔

حافظ

سرم خوشست و ببانگِ بلند می گویم
کہ من نسیم حیات از پیالہ می جویم
عبوس زہد بوجہ خمار ننشیند
مرید خرقۂ دردی کشان خوشخویم
شدم فسانہ بسرگشتگی و ابروی دوست
کشید در خم چوگان خویش چون گویم
گرم نہ پیر مغان در بروی بگشاید
کدام در بزنم چارہ از کجا جویم
مکن درین چمنم سرزنش بخود روئی
چنانکہ پرورشم مید ہند میرویم
تو خانقاہ و خرابات درمیانہ مبین
خدا گواہ کہ ہر جا کہ ہست با اویم

اقبال

باین بہانہ درین بزم محرمی جویم
غزل سرایم و پیغام آشنا گویم
بخلوتی کہ سخن می شود حجاب آن جا
حدیث دل بزبان نگاہ می گویم
پی نظارۂ روی تو می کنم پاکش
نگاہ عشق بجوی سرشک می شویم
چو غنچہ گرچہ بکارم گرہ زنند دلی
ز شوق جلوہ گہ آفتاب می رویم
چو موج سازِ وجودم ز سیل بے پرواست
گمان مبر کہ درین بحر ساحلی جویم
میانۂ من و او ربط دیدہ و نظر است
کہ در نہایت دوری ہمیشہ با اویم

غبار راہ طلب کیمیای بہروزیست
غلام دولت آن خاک عنبرین بویم

زشوقِ نرگس مست بلند بالائی
چو لالہ قدح افتادہ برلب جویم

بیار می کہ بفتوئ حافظ دل پاک
غبار زرق بفیض قدح فرو شویم

کشید نقش جہانی بپردۂ چشمم
زدست شعبدہ بازی اسیر جادویم

درون گنبد دربستہ اش نگنجیدم
من آسمان کہن را چو خار پہلویم

بآشیان نہ نشینم ز لذت پرواز
گہی بشاخ گلم گاہ برلب جویم

حافظ کی غزل ان کے معروف و مشہور مشرب کے اظہار سے شروع ہوتی ہے اور وہ عالم سرمستی میں اپنی زندگی گزارنے کا ڈھنگ صاف اور سیدھے انداز میں پیش کرتے ہیں دوسرا شعر اسی مسلک کی مزید ترجمانی کرتا ہے "خوشخو" کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک "دردکشان" کی کتنی اہمیت ہے تیسرے شعر کا "شدم فسانہ" کا ٹکڑا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس اشارہ کے بعد وہ اپنی بات "شاہد و شراب" کے پردے میں کہہ کر قاری کو اس تلخی سے بچا لیتے ہیں جو "شدم فسانہ" کی وجہ سے اس پر طاری ہو سکتی تھی، اس کے بعد وہی ساقی اور در ساقی کی باتیں ہیں جو قاری کے اضمحلال کو مزید دور کر کے حافظ کی بات سمجھنے کی راہ کو آسان کرتی ہیں، اس کے بعد وہ جبر کا وہ مضمون پیش کرتے ہیں جو ان کی غزلوں میں اکثر نظر آتا ہے اس جبر کے مضمون سے پھر اندیشہ ہوتا ہے کہ قاری تلخی سے دوچار ہو جائے گا اس لیے وہ فنکارانہ انداز سے اس کی توجہ "خانقاہ و خرابات" کی طرف موڑ دیتے ہیں اور راہ طلب کا نغمہ الاپتے ہوئے پھر "نرگس مست" اور "لالہ" کا سہارا لے کر اپنی حالت کی تصویر کشی کرتے ہیں اور آخر میں دوبارہ اپنے مشرب کا اظہار کرتے ہوئے غزل ختم کر دیتے ہیں۔ اس غزل کی مجموعی فضا وہی ہے جس کو انھوں نے ایک مصرع میں بیان کر دیا ہے کہ "کہ من نسیم حیات از پیالہ می جویم" اور "می جویم" کا یہ مرحلہ مختلف منازل سے ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے۔ اس غزل میں شاعر کا جو اضطراب پنہاں ہے اس کو واضح کرنے کے لیے اس نے علائم کا سہارا لیا ہے اور "بہ کمال گویا یست" کی مثال بن گیا ہے۔

اقبال نے شعوری طور پر حافظ کی غزل پر غزل لکھی ہوگی اس لیے اس کے اثرات سے بچنے کے لیے انھوں نے مطلع ہی سے کوشش شروع کی ہے لیکن لفظ "جویم" کے مشترک ہونے سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ دونوں شاعروں کا نقطۂ آغاز ایک ہے۔ ایک "حرمی جویم" سے آغاز سفر کرتا ہے اور دوسرا "کہ من نسیم حیات از پیالہ می جویم" سے نسیم حیات اور حرم میں اگرچہ کوئی مماثلت نہیں ہے لیکن "می جویم" کے لفظ سے دونوں کے محرکات کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے اور اس راہ کے مختلف مراحل سے واقف ہوا جا سکتا ہے۔ دونو

شعر میں "جوہم" کا مرحلہ حدیث دل کو زبان نگاہ سے کہنے میں بدل جاتا ہے اور قاری ایک دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے اور اس طرح شاعر "نظارہ" "نگاہ عشق" اور جوئے سرشک کی باتیں کرتا ہوا اپنی بات کو تھوڑی سی وضاحت "ز شوق جلوہ گہ آفتاب می ر دیم" کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ شاعر یہاں تک قاری کو دھیرے دھیرے اپنے ساتھ لایا ہے اور اب دوبارہ اس کو "جوہم" کے ایک نئے مرحلے سے آشنا کرتا ہے لیکن بار بار "جوہم" کی تکرار سے اس بات کا خدشہ ہے کہ قاری مکدر ہو جائے گا اس لیے وہ حافظ کی آواز سے اپنی آواز ملا کر یوں گویا ہوتا ہے ؎

میانۂ من و او ربط دیدہ و نظر است	کہ در نہایت دوری ہمیشہ با اویم

اس کے بعد کے دو شعروں میں پھر وہ قاری کی توجہ دوسری باتوں کی طرف مبذول کر کے آخر میں پھر اسی "جوہم" کے مرحلے کی تصویر کشی کرتا ہوا اپنی بات کو ختم کر دیتا ہے۔

ان دونوں غزلوں کا آغاز "جوہم" کے عمل سے ہوتا ہے حافظ کے یہاں جوہم کا پیمانہ "پیالہ" ہے اور اقبال کے یہاں غزل سرائی یعنی ایک نے صراحت کو اپنایا ہے اور دوسرے نے ابہام کو اس ابہام کے باوجود اقبال کی فکر، فکر حافظ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور وہ "نقش جہاں" "پردۂ چشم" "دست شعبدہ بازے" اور "جادو" وغیرہ کے الفاظ کا سہارا لے کر ہی اپنی داستانِ جستجو پیش کر سکے اسی لیے ہمارا خیال ہے کہ یہ غزل بھی اقبال نے حافظ کی غزل سے متاثر ہو کر لکھی ہے اور اس کو بھی حافظ کی قبیل کی غزلوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

طوالت کے خیال سے ہم اتنی ہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ غزلیں تھیں جو حافظ ہی کی زمین میں کہی گئی ہیں ان غزلوں کے علاوہ ہم ان غزلوں کا بھی تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو اگرچہ حافظ کی زمین میں نہیں کہی گئی ہیں لیکن ان میں بھی حافظ کا طربیہ رنگ اور زندگی سے کھیلنے کا انداز صاف طور سے دیکھا جا سکتا ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ اقبال کی شاعری پر حافظ کے رنگ کی گرفت کتنی مضبوط تھی۔

### رنگِ حافظ

فصل بہار این چنین بانگ ہزار این چنین	چہرہ گشا، غزل سرا، بادہ بیار این چنین
اشک چکیدہ ام ببین ہم بنگاہ خود نگر	ریز بہ نیستان من برق و شرار این چنین
باد بہار را بگو پی بخیال من برد	وادی و دشت را دہد نقش و نگار این چنین
زادہ باغ و راغ را از نفسم طراوتی	در چمن تو زیستم با گل و خار این چنین

عالم آب و خاک را بر محک دلم بسای    روشن و تار خویش را گیر عیار این چنین

دل بکسی نباخته با دو جهان نساخته    من بحضور تو رسم روز شمار این چنین

فاخته کهن صفیر ناله ی من شنید و گفت
کس نسرود در چمن نغمه ی پار این چنین

نظر براه نشینان سواره میگذرد    مرا بگیر که کارم ز چاره میگذرد

بدیگران چه سخن گسترم ز جلوه دوست    بیک نگاه مثال شراره میگذرد

رهی بمنزل آن ماه سخت دشوار است    چنان که عشق بدوش ستاره میگذرد

ز پرده بندی گردون چه جای نومید است    که ناوک نظر ما ز خاره میگذرد

یمی ست شبنم ما کهکشان کناره اوست    بیک شکستن موج از کناره میگذرد

بخلوتش چو رسیدی نظر باو مگشا    که آن دمیست که کار از نظاره میگذرد

من از فراق چه نالم که از هجوم سرشک
ز راه دیده دلم پاره پاره میگذرد

زمستان را سر آمد روزگاران    نواها زنده شد در شاخساران

گلان را رنگ و بو بخشد هواها    که می آید ز طرف جویباران

چراغ لاله اندر دشت و صحرا    شود روشن تر از باد بهاران

دلم افسرده تر از صحبت گل    گریزد این غزال از مرغزاران

دمی آسوده با درد غم خویش    دمی نالان چو جوی کوهساران

ز بیم این که ذوقش کم نگردد
نگویم حال دل با رازداران

حلقه بستند سر تربت من نوحه گران    دلبران زهره وشان گلبدنان سیمبران

در چمن قافله ی لاله و گل رخت گشود    از کجا آمده اند این همه خونین جگران

ای که در مدرسه جویی ادب و دانش و ذوق    نخرد باده کس از کارگه شیشه گران

خرد افزود مرا درس حکیمانه فرنگ    سینه افروخت مرا صحبت صاحب نظران

برکش آن نغمه که سرمایه ی آب و گل است    ای ز خود رفته تهی شو ز نوای دگران

کس ندانست که من نیز بهای دارم

اگر ان غزلوں کا غائر نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی مخصوص فکر ہر جگہ ان کا ساتھ نہیں دیتی اور وہ عالم اضطراب میں وہی بولی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس سے حافظ کی پوری شاعری عبارت ہے۔

اس موقع پر ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ جب اقبال نے رنگ حافظ سے اس قدر استفادہ کیا ہے تو پھر کس وجہ سے ان کی شاعری کے مخالف تھے؟ ہمارا خیال ہے کہ اقبال کی شخصیت میں کئی اقبال برسرپیکار رہتے تھے ایک تو وہ اقبال تھا جو فلسفۂ جدیدہ اور علوم و فنون کا تقابلی مطالعہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اسلام ہی وہ دین ہے جس پر چل کر عالم انسانیت فلاح و بہبودی کا راستہ پا سکتی ہے، یہ اقبال نظم و نثر میں اپنے افکار براہ راست انداز سے پیش کرنے کا عادی تھا۔ اس کے برعکس ایک دوسرا اقبال تھا جو حسن و عشق کا شیدا تھا اور اس دنیا کو بازیگاہِ طفلاں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا یہ دونوں اقبال ہمیشہ برسرپیکار رہتے اور زیادہ ترجیت پہلے ہی اقبال کی ہوتی۔ دوسرے اقبال کا نظریۂ زندگی اور دنیا سے طریق آشنائی حافظ کے نظریۂ زندگی اور اس کے دنیا سے طریق آشنائی سے ملتا جلتا تھا اسی لیے وہ دوسرے اقبال کے ساتھ ساتھ حافظ کا بھی مخالف ہو جاتا جب پہلے اقبال کی گرفت مضبوط تو اس کی نغمہ سرائی یوں ہوتی ؎

ہوشیار از حافظ صہبا گسار		جامش از زہر اجل سرمایہ دار

اور جب دوسرے اقبال کی گرفت مضبوط ہوتی تو یہی اقبال یوں نغمہ سرا ہوتا ؎

چہ ندید نی ست اینجا کہ شرر جہان را		نفسی نگاہ دارد نفسی دگر ندارد

اسی لیے ہمارا خیال ہے کہ حافظ کی شاعری کا مخالف صرف وہ اقبال ہے جو علوم جدیدہ کے مطالعہ کے بعد شعوری طور پر مسلمان ہوا اور وہ اقبال جو صرف ایک فن کار اور حسن و عشق کا والہ و شیدا ہے نہ صرف رنگِ حافظ سے متاثر ہے بلکہ اس سے اکتساب فیض بھی کرتا رہتا ہے۔

---